Tarjihaat
Volume: II
Issue: XI
November 2022
نومبر ۲۰۲۲
آن لائن ادبی رسالہ
ترجیحات
ISSN: 2583-0082

ڈاکٹر محمد عامر

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-110067

علامہ اقبال کی فکری تشکیل اور ان کا عہد

ادیب یا شاعر کے فن پارے کو سمجھنے کے لیے اس کی فکری تشکیل، حالات زندگی اور اس کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کو سمجھے بغیر اس کے فن پارے کی تشریح و تعبیر نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ ادب اپنے عہد کے سماجی و سیاسی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ علامہ اقبال کی ولادت (انیسویں صدی عیسوی کی آٹھویں دہائی میں یعنی) 1877ء میں ہوتی ہے۔ مگر ہمیں علامہ اقبال کے افکار و نظریات اور شاعری کے اسرار و رموز کو جاننے کے لیے ان کے عہد کے مطالعے کے ساتھ ان کی ولادت کے تقریباً بیس سال قبل یعنی 1857ء سے حالات کا جائزہ بھی لینا ہوگا، تبھی ہم علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ اور ان کے عہد کو بحسن خوبی سمجھ سکتے ہیں۔

1857ء کے انقلاب کے بعد ہندوستان پوری طرح برطانوی حکومت کی زنجیرِ غلامی میں جکڑ گیا تھا۔ یہ انقلاب محض ایک واقعہ یا سانحہ نہیں تھا بلکہ ہمارے جوش و خروش اور مستقبل کے عزائم کا پرتو تھا۔ اس انقلاب نے یہاں کے ادیبوں، مفکروں اور سیاسی رہنماؤں تک کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان لوگوں نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات کو سدھارنے اور اسے بہتر بنانے کا عزم کیا نیز اپنے تئیں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ دوسری طرف ان حالات سے نمٹنے میں اصلاحی تحریکوں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ ہندوستان میں 1857ء کے انقلاب سے قبل کچھ ایسی تحریکیں معرض وجود میں آچکی تھیں جو اس عہد کے عوام میں معاشرتی اصلاح، تعلیمی بیداری اور حصول آزادی کے لیے کام کر رہی تھیں۔ 1857ء کے بعد جو تحریکیں وجود میں آئیں ان کا مقصد تھا کہ سماجی، سیاسی، معاشی، اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے یہاں کی عوام کو بہتر بنایا جاسکے۔ ایسے ہی ناہموار فضا میں ہندوستان میں ایک مخلص اور قومی رہنما (جسے دنیا آج سر سید احمد خان کے نام سے جانتی ہے) نے آگے آکر قوم کو پستی، زبوں حالی سے نکالنے اور ان کے اندر معاشرتی اصلاح اور تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ سر سید نے پہلے پہل آزادی کا راگ نہیں الاپا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ بغیر تعلیم اور اصلاح کے آزادی ملنا مشکل ہے اور اگر مل بھی گئی تو لاحاصل ہوگی۔ لہٰذا انھوں نے قوم کے اندر اصلاحی پہلو پر زیادہ زور صرف کیا۔ ان کا مقصد قوم کو تعلیمی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر بیدار کرنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک قوم کے اندر تعلیمی،

سماجی، سیاسی اور اخلاقی بگاڑ رہے گا تب تک ہم دیگر قوموں کی طرح ترقی، اور انگریزوں سے آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لیے انھوں نے آزادی کی تحریک کے بجائے معاشرتی اصلاح اور تعلیمی بیداری پر زیادہ زور دیا۔

سرسید نے قوم کی اصلاح کے لیے جو بھی مضامین لکھے وہ سلیس اور سادہ زبان میں لکھے کیوں کہ وہ اس چیز سے باخبر تھے کہ اگر تحریر میں بناوٹ اور تصنع باقی رہا تو پھر عوام کی اصلاح ناممکن ہے۔ اس کام کو انھوں نے نثر کے ذریعہ انجام دیا جب کہ وہ شاعر نہیں تھے اس لیے وہ ہمیشہ اس بات کی خواہش کرتے تھے کہ کاش کہ اردو زبان میں ایسا شاعر پیدا ہوتا جو اپنی شاعری کے ذریعہ پست حالی اور گمراہی میں پڑی قوم کو بیدار کرتا، ان کے رفقا میں حالی نے اس فریضہ کو انجام دیا۔ جنھوں نے مسدس حالی لکھ کر اس خلا کو پر کیا اور قوم کو بیدار کرنے کی اہم کوشش کی اور اسی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ مسدس حالی کو سرسید اپنے لیے نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

سرسید کے اصلاحی مشن میں حالی کے شانہ بہ شانہ مولانا محمد حسین آزاد کا نام بھی کافی اہم ہے۔ 1865ء میں لاہور میں آزاد کے توسط سے انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ 1867ء میں آزاد اس انجمن کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ یہاں انھیں کرنل ہالرائڈ کی مدد سے 1874ء میں انجمن کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا موقع ملا۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مصرع طرح کے بجائے شاعروں کو موضوع دیا جاتا تھا۔ یہیں سے جدید شاعری یا نیچرل شاعری کی بنیاد پڑتی ہے جس کے اثرات اردو شاعری میں علامہ اقبال کے عہد تک بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، حالاں کہ اگر موضوعات کی سطح پر دیکھا جائے تو غالب کی شاعری انقلاب کے بعد بالکل نیا انداز رکھتی ہے خود غالب نے اس کا اعتراف کیا ہے:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

غالب عشق و عاشقی کے محدود دائرے اور سکہ بند فکر سے باہر آکر جدید و عمیق موضوعات کو اردو شاعری کا جامہ پہنا چکے تھے۔ آگے چل کر انجمن پنجاب کے مشاعرے نے منظم طریقے سے اس جدت کو آگے بڑھایا بعد ازاں اردو شاعری کی مختلف اصناف پر تنقیدی آرا بھی پیش کی گئیں۔ حالی نے جب اپنا دیوان مرتب کیا تو اس کے مقدمے میں اردو شاعری کی مختلف اصناف پر تنقیدی نظر ڈالی جس میں انھوں نے غزل اور قصیدہ پر سخت اعتراض کیا، مگر غزل نے خود کو وقت اور حالات کے تقاضات و مطالبات کے مطابق ڈھال کر اپنے دامن میں وسعت پیدا کی۔ علامہ اقبال جیسے مفکر اور فلسفی شاعر نے شاعری کا آغاز صنف غزل سے کیا اور اپنے فکر و فلسفہ سے غزل کے دامن میں توانائی بخشی، مگر بہت جلد غزل سے نظم کی طرف مراجعت کر گئے۔

اقبال کی ذہنی اور فکری تشکیل کے ارتقا میں غالب کی شاعری، 1857ء کا انقلاب، سرسید تحریک اور انجمن پنجاب کا مشاعرہ خاصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اردو ادب کے طالب علم انجمن پنجاب کے مشاعرے سے بخوبی واقف ہیں۔ پچھلے صفحات میں اس کے

کارنامے پر مختصراً بحث کی جاچکی ہے، لیکن اب میں اجمالی طور پر اس کے دوررس نتائج پر بھی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، کیوں کہ اس کے بغیر ہم علامہ اقبال کی فکری تشکیل اور ان کے عہد کو بہتر طریقے سے نہیں سمجھ سکتے۔ انیس ویں صدی عیسوی کے اواخر میں علامہ اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اس وقت حالیؔ، اکبرؔ الہ آبادی، داغؔ دہلوی اور شادؔ عظیم آبادی اردو شاعری کے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ حالیؔ اور آزادؔ اردو شاعری کو نیچرل اور ادب کو تنقید حیات بنانے میں لگے ہوئے تھے، جس کے تحت انھوں نے متعدد تخلیقی کارنامے انجام دیے، جس کی زندہ مثال حالیؔ کی 'مسدس' اور آزاد کی 'صبحِ امید' ہے۔ اسی عہد میں اکبرؔ الہ آبادی طنز و ظرافت کا لبادہ پہنے انگریزی حکومت پر مسلسل وار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ داغؔ دہلوی اور شادؔ عظیم آبادی بھی اسی عہد کے دو بڑے نام ہیں۔ داغؔ دہلوی عشق و محبت کی داستان کو لے کر اردو شاعری میں داخل ہوئے اور شادؔ عظیم آبادی حالات اور سماجی تبدیلی کا اثر قبول کرتے دیکھے جا سکتے ہیں۔

علامہ اقبال کے معاصرین میں حسرتؔ، یگانہؔ، فانیؔ اور جگرؔ کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر علامہ اقبال کے معاصرین کا ذکر کرنا مقصود نہیں، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت کس نوعیت کی شاعری کی جا رہی تھی، تبھی ہم ادبی سطح پر علامہ اقبال کی فکری تشکیل اور ان کے عہد کو سمجھ سکتے ہیں۔ حسرتؔ کی شاعری کا بیشتر حصہ قدیم روایت سے منسلک ہے، اصغرؔ کے یہاں تصوف کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے اور فانیؔ یاسیات کے امام ہیں۔ غرض یہ کہ اس عہد میں جس نوع کی شاعری ہو رہی تھی اس کے تمام عناصر علامہ اقبال کی شاعری میں بیک وقت موجود ہیں۔ اس عہد میں علامہ اقبال ہی ایک ایسے شاعر تھے، جن کے کلام میں بیک وقت فلسفہ، تصوف، سماجی مسائل، سیاسی شعور، تہذیبی بساط، انسانی عظمت، حب الوطنی، قومی یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد، مظلوموں کا درد اور روحانی احساسات دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ اس عہد میں علامہ اقبال ہی ایک ایسے شاعر تھے، جن کے یہاں قدیم و جدید دونوں روایتوں کے مابین مستحکم اور مضبوط رشتہ دکھائی دیتا ہے۔ اس عہد کے بیشتر شعرا نے روایت کو عادت کے طور پر اختیار کیا، جب کہ علامہ اقبال نے روایت کو عادتاً قبول نہیں کیا، بلکہ انھوں نے روایت سے منسلک ہونے کے ساتھ ذہنی، سماجی، تہذیبی اور زبان و بیان کی سطح پر بھی اپنی شاعری میں جدت پیدا کرنے کوشش کی۔ جسے ہم علامہ اقبال کی انفرادی خوبی کہہ سکتے ہیں۔ اسی سیاق میں اقبال کے بارے میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

'اقبال نے اسلاف کی عظمت کا تصور حالیؔ سے اور مغربی تہذیب کی نفی کا تصور اکبرؔ سے مستعار لیا ہے''۔

اسی سلسلے میں وزیر آغا مزید رقم طراز ہیں:

''اقبال ان بڑے شعرا میں سے ہیں جو ہمیشہ تعمیر اور تخریب کے سنگم پر نمودار ہوتے ہیں۔ جن کے ہاں ایک طرف تو نئے زمانے کی شکست و ریخت کا عرفان اور دوسری طرف ماضی کے نظم و ضبط کا احترام موجود ہوتا ہے اور جو آنے والے زمانے کی چاپ کو سننے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے شعرا کو نئے اور پرانے سبھی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ان کی قدامت یا جدیدیت کے بارے میں گرمیٔ گفتار کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے''۔ 1

نئے حالات اور روایت سے مستحکم رشتہ بنانے کے پیچھے اس عہد کا سماجی اور سیاسی ماحول معنی رکھتا ہے جسے اقبال نے شعوری طور پر قبول کیا۔

علامہ اقبال کے عہد کا جائزہ لیتے ہوئے جب ہم ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اردو شاعری میں ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ خود علامہ اقبال فلسفہ وتاریخ کے طالب علم رہے ہیں، جس کا مطالعہ انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں گہرائی اور دروں بینی سے کیا تھا۔ علامہ اقبال نے مشرق و مغرب کے فلسفے کو سامنے رکھ کر ایک نئے فلسفے کی تشکیل دی اور یہی ان کی عظمت کی مسلم دلیل ہے۔ اس سلسلے میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''جہاں تک مشرقی اور مغربی فلسفے کو آپس میں ملانے کا تعلق ہے اقبال کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ایک مضبوط پل کا کام دیا ہے''۔2

یہاں پر ایک بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ علامہ اقبال نے مغربی فلسفے سے صرف وہی لیا جو صالح و صحت مند عناصر کی پاسداری کر رہے تھے جیسے نطشے کا فوق البشر، مگر انھوں نے اس فلسفے کو مشرقی تہذیب و تمدن میں ڈھال کر اس انداز میں پیش کیا کہ وہ مشرقی مزاج سے بالکل ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ جہاں تک کلام اقبال میں شاہین کے استعارے کا تصور ہے تو اس کو انھوں نے محض ایک پرندے کے طور پر نہیں پیش کیا بلکہ اس کی بلند پروازی، حوصلہ مندی، ہمت اور خوبیوں کو انسانی عظمت کے لیے عملی صورت میں دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ قوم کو کھویا ہوا وقار مل سکے۔ اس کے متعلق یہ شعر یہاں نقل کرنا بے جا نہ ہوگا:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبال اپنے ایک خط میں مزید شاہین کی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاہین ایک خوددار اور غیرت مند پرندہ ہے اور کسی کے ہاتھ کا مارا شکار نہیں کھاتا۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ بلند پرواز ہے۔ خلوت پسند ہے، تیز نگاہ ہے''۔3

افکار اقبال میں عظمت انسان کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ شاہین کا استعارہ بھی اسی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جہاں سیاسی اتھل پتھل کے چلتے انسانی عظمت پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ اقبال انسانی عظمت کے صرف قائل ہی نہیں تھے، بلکہ اس کے حصول کے لیے کوشاں بھی تھے۔ یہی وہ ان کی فکر ہے جو ان کے کلام کو عالم گیر بنا دیتی ہے۔ چند اشعار کلام اقبال سے ملاحظہ ہوں:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفی سے مجھے

کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردُوں

علامہ اقبال کی ذہنی و فکری تشکیل میں ان کے استاد پروفیسر آرنلڈ کا اہم رول رہا ہے۔ انہیں کی سرپرستی میں علامہ اقبال نے فلسفہ کا مطالعہ کیا تھا۔ آرنلڈ کے ہندوستان سے جانے کے بعد اقبال کی ملاقات ان سے انگلینڈ میں ہوئی اور وہاں پر بھی علامہ اقبال ان سے فیض یاب ہوئے۔ یورپ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد علامہ اقبال نے ہندوستان آکر وکالت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ اسی دوران انھوں نے مسلم لیگ کی رکنیت بھی اختیار کی۔ یہیں سے علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ بعدازاں علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے مختلف اجلاس میں شرکت کی اور اس میں انھوں نے برطانوی حکومت کو ہدف تنقید بنایا۔ 1914ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی، جس کی وجہ سے مشرقی ممالک کے مابین اتحاد کو قائم رکھنا محال ہو گیا تھا، ایسی حالت میں ہندوستان کیسے بچ سکتا تھا، کیوں کہ اس وقت ہندوستان برطانوی حکومت کے ماتحت تھا۔ انگریز پہلے سے ہی بانٹو اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اسی پالیسی کی وجہ سے ہندوستان میں دو قوموں کے مابین نفرت پھیلی جو خود ساختہ نہیں بلکہ ایک منصوبہ بندی کے تحت اس کو مضبوطی ملی تھی، مگر پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد برطانوی حکومت سے نجات پانے کے لیے ہندوستانیوں نے متحد ہو کر آزادی کی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا، جس سے انگریزوں کو شدید دھکا لگا۔ اس اتحاد میں کانگریس کا لکھنؤ سیشن (1916ء) تاریخی حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی وقت مہاتما گاندھی جیسے ہندوستانی رہنما نے تحریک آزادی کی جدوجہد میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ مہاتما گاندھی نے قومی فلاح و بہبود کے لیے ستیہ گرہ شروع کیا اور عوام میں سیاسی بیداری کا صور پھونکا۔ دیگر مفکرین اور سیاسی رہنماؤں نے معاشرے میں سماجی برائیوں کو دور کرنے کی اہم کوشش کی۔ علامہ اقبال نے بھی سرکاری ملازمت کو ترک کر کے ہندوستان کی تحریک آزادی کی جدوجہد میں منہمک ہو گئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر منظر اعجاز لکھتے ہیں:

''مہاتما گاندھی مذہبی نقطۂ نظر سے مسائل کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے جب کہ اقبال نے تاریخی اور فلسفیانہ انداز نظر سے موجودہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اہنسا اور داخلی توانائی کے تصورات نے ظالمانہ اور جابرانہ تسلط کا مقابلہ کرنے کے لیے اقبال کی نظام فکر میں ''خودی'' کا روپ دھار لیا''۔4

علامہ اقبال نے دوران وکالت معلمی کا پیشہ بھی اختیار کیا، مگر بہت جلد استعفیٰ دے کر اس سے کنارہ کش بھی ہو گئے۔ استعفیٰ دینے کی وجہ انھوں نے اپنے کچھ دوستوں کو یہ بتائی کہ جو میں کہنا چاہتا تھا وہ سرکاری ملازمت میں رہ کر نہیں کہہ پاتا۔ معلمی کے پیشے سے استعفیٰ دینے کے بعد وہ سیاست میں پہلے کے مقابلے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے، جو بات پہلے وہ کھل کر کہنے میں تامل کرتے اب وہی بات بلاخوف و تردد کہنے کے لیے آزاد تھے۔ انھوں نے ہندوستانی قوم کو عظمت انسانی سے باور کرایا۔ ان کی مقبولیت کا لوہا اردو ادب اور ہندوستانی سماج میں اس وقت تسلیم کیا گیا جب انگلینڈ میں پروفیسر آر۔ کے۔ نکلسن نے ان کی مشہور و معروف تصنیف 'اسرار رموز' کا

ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔اِس سے اقبال کی مقبولیت اور شہرت میں چار چاند لگ گیا۔ان کی مقبولیت اور شہرت کو دیکھتے ہوئے ہندوستانی برطانوی حکومت نے 1922ء میں 'سر' کے خطاب سے نوازا۔

عہدِ اقبال میں انقلاب روس بھی سیاسی، تہذیبی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور ادبی طور پر کافی اہمیت کا حامل ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران ہی 1917ء میں لینن کی سربراہی میں مزدوروں اور کسانوں نے متحد ہو کر بادشاہ روس زار کا تختہ پلٹ دیا اور ایک نئی حکومت نئے عزائم کے ساتھ سامنے آئی۔ غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے اس اتحاد نے پوری دنیا کو ایسا پیغام دیا کہ اگر متحد ہو جائیں تو ظالم سے ظالم حکومت کو ملیامیٹ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ چاروں طرف اس انقلاب کی بازگشت سنائی دینے لگی اور یہ پیغام اشتراکیت کے نظریے کے نام سے جانا گیا۔ سماجی، سیاسی اور ادبی سطح پر اس عہد میں اس کے گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں بھی مزدوروں، غریبوں اور کسانوں کو متحد کیا جانے لگا اور باشعور و حساس لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ سرمایہ دار، مزدوروں اور کسانوں کا استحصال کرتے ہیں، چوں کہ اس وقت تحریک آزادی کی جدوجہد بھی زوروں پر تھی اس لیے سیاست داں اور ادیبوں کو بھی احساس ہوا کہ اگر غریبوں اور کسانوں کو متحد کر کے ان کو سرمایہ داروں کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی جا سکتی ہے، نیز تحریک آزادی میں بھی ان کی مدد لی جا سکتی ہے۔ اس انقلاب کے اثرات کو کلام اقبال میں جابجا دیکھا جا سکتا ہے۔ کلامِ اقبال میں جہاں فلسفہ، حب الوطنی، قومی یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے عناصر دیکھنے کو ملتے تھے وہیں اب مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔اور پوری شدومد سے مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کی حمایت میں اشعار کہنے لگے تھے۔ علامہ اقبال سے متاثر ہو کر اس عہد کے دوسرے نوجوان شعرا نے بھی غریبوں اور مظلوموں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ حالاں کہ کمیونزم اور انقلاب روس سے متاثر ہو کر تقریباً بیس سال بعد ہندوستان میں 1936ء میں ترقی پسند مصنفین نے ایک تحریک چلائی، جس کو اقبال کی بھی حمایت حاصل رہی تھی، لیکن اس تحریک سے قبل ہی اقبال اپنی شاعری میں مظلوموں اور مزدوروں پر ہو رہے بے جا ظلم و ستم اور کسانوں پر سرمایہ داروں کے ذریعہ کیے جا رہے استحصال کو موضوع بنا چکے تھے۔ کلام اقبال میں اس کی متعدد مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی　　اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

ادبی حیثیت سے علامہ اقبال کا عہد بڑی اہمیت اور خصوصیت کا حامل رہا ہے۔ اس زمانے میں فن برائے زندگی کے بجائے فن برائے فن کو ترجیح دی جا رہی تھی، لیکن علامہ اقبال فن برائے زندگی کے قائل تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے فن برائے فن کو بالائے طاق رکھ دیا، بلکہ وہ ادب میں اسلوب اور حسن سے زیادہ موضوع کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی عہد میں رومانوی ادب بھی ظہور پذیر ہوا، جس نے فن برائے فن کو بنیادی حیثیت کا درجہ دیا اور فن پارے میں حسن کو ہی سب کچھ سمجھا جانے لگا۔ اقبال فن برائے زندگی کے ساتھ

فن برائے فن کو بھی ادب کے لیے ضروری سمجھتے تھے، لیکن حسن سے زیادہ وہ موضوع کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ان کے فن کا کمال ہے کہ فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی دوئی ان کے یہاں نظر نہیں آتی، بلکہ یہ دونوں دھارے اس طرح سے آپس میں گھل مل جاتے ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جگن ناتھ آزاد اپنی کتاب 'اقبال اور اس کا عہد' میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جس دور میں چاروں طرف ''فن برائے زندگی'' کے پردے میں فن برائے فن کے بلکہ فن برائے موت کے اصول پر عمل ہو رہا تھا ۔اقبال صحیح معنوں میں فن برائے زندگی کے علم بردار اور موید بن کر آئے۔اقبال نے اس حقیقت تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگائی کہ فن میں حسن کے مدارج نہیں ہوا کرتے۔ جہاں تک حسن کا تعلق ہے ایک فن پارہ یا حسین ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا۔اس پرکھ میں تیسرا پہلو کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ دراصل فن کی عظمت ہے جس کے مدارج ہوتے ہیں۔ فن کا رتبہ بلند ہے یا پست اس کا تعلق حسن سے نہیں بلکہ موضوع و معانی کے ارتباط سے طے ہوتا ہے۔ حسن کا تعلق محض فن کی ہیئت سے ہے۔ عظمت کا تعلق خیال موضوع اور معانی سے ہے۔ یہ دراصل خیال کی عظمت ہے جس سے شعر میں عظمت پیدا ہوتی ہے۔ حسن سے شعر حسین ہو سکتا ہے عظیم نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ادب میں حسین و جمیل شاعری کی کمی نہیں عظیم شاعری کی کمی ہے۔۔۔اقبال نے ہماری توجہ شعر کے اس نام نہاد حسن سے ہٹا کر موضوع و معانی کی طرف مبذول کی۔اس موضوع و معانی کی طرف جو الفاظ سے ہم آہنگ ہو کر شعرِ دلنشیں کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔اقبال نے حرف و معنی کے ارتباط کو جان و تن کے اختلاط سے تشبیہ دی اور حرف کا معنی سے وہی تعلق بتایا ہے جو خاکستر اخگر کا اخگر سے ہے''۔5

مجموعی طور پر یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال اردو ادب اور ہندوستانی معاشرے کے ایک ایسے شاعر ہیں، جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے عہد کی مکمل عکاسی کی ہے۔انھوں نے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کو شعوری طور پر قبول کیا جس کی مثال اس عہد کے کم ہی شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔جب انگریزوں نے اپنی پالیسی کے تحت ہندوستانی قوم میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی تو علامہ اقبال ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار بن کر سامنے کھڑے ہو گئے۔کلام اقبال سے ہندو مسلم اتحاد پر مشتمل یہ شعر ملاحظہ ہو::

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

غرض کہ حالات نے جس قسم کی شاعری کا مطالبہ کیا علامہ اقبال نے اس کو اپنی شاعری میں من و عن پیش کیا۔ مسلمانوں کو ان کی عظمت کا احساس دلانے کے لیے اسلامی تاریخ کا سہارا لیا اور اس کے ذریعہ ان کے وقار و مرتبہ کو بلند کرنے کی سعی کی۔ایک شعر ملاحظہ ہو:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا　　لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

حکومت یا سرمایہ داروں کے ذریعہ غریبوں اور کسانوں پر کیے جارہے مظالم کے خلاف انھوں نے انقلابی شاعری پیش کی اس طرح وہ شاعر انقلاب کی حیثیت سے بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی

علامہ اقبال تحریک آزادی کی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی ہزاروں سال کی مشترکہ تہذیب و ثقافت سے انھوں نے قوم کو روشناس کرایا۔ غرض کہ علامہ اقبال ایک شاعر کے ساتھ مفکر، فلسفی، ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار اور قومی یکجہتی کے داعی کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ عہد حاضر میں اگر علامہ اقبال کے افکار و نظریات پر عمل کیا جائے تو ایک بہتر سماج کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ نیز ان کے افکار و نظریات پر عمل کر کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی برائیوں کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے، مگر افسوس یہ کہ علامہ اقبال کو آج خالص اسلامی شاعر کا تمغہ دے کر ان کے افکار و نظریات کو ایک محدود دائرے میں دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے ادبی مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ آج بھی ان کے افکار و نظریات کو وہی اہمیت حاصل ہے جیسا کہ خود ان کے عہد میں تھی۔

☆☆☆

حواشی:

1۔ شمیم حنفی؛ نئی شعری روایت، نئی دہلی؛ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1987ء، ص23

2۔ آزاد، جگن ناتھ؛ اقبال اور اس کا عہد، الٰہ آباد؛ ادارۂ انیس، 1960ء، ص119

3۔ بحوالہ جگن ناتھ آزاد؛ اقبال اور اس کا عہد، ص121

4۔ منظر اعجاز؛ اقبال اور قومی یکجہتی، مظفر پور؛ ناشر مصنف، 1994ء، ص48

5۔ جگن ناتھ آزاد؛ اقبال اور اس کا عہد، ص89-90-91